اسبابِ کافی

بقلم حذیفہ

اسبابِ کافی

بقلم حذیفہ

بسم الله الرحمن الرحیم

و الصلاۃ والسلام علی رسولہ و آلہ و صحبہ۔

یہ دنیا دار الاسباب ہے۔ یہاں باقی رہنے کے لیے ہمارے پاس کافی اسباب کا ہونا واجب ہے۔ مثلا کھانا و پانی کہ اگر ہمیں کھانا نہ ملے تو جلد موت ہو جائے، و اگر پانی نہ ملے تو اور جلدی مر جائیں۔ لیکن زندہ رہنے کے لیے گوشت کھانا ضروری نہیں ہے، بلکہ پھل سبزی ہی کافی ہے۔ و ایسے ہی پکا پانی یا آسمُوسِسِ عکسی[1] ضروری نہیں ہے بلکہ دریا و تلاب کا صاف پانی کافی ہے۔ و یہی مراد ہے میری کافی اسباب سے۔ لیکن اگر گوشت و پکا پانی مہیا ہو تو وہ فاضل ہے۔ و اگر پھل و سبزی بھی مہیا نہ ہو تو گھانس و پتا کھا کے گزارا کرنا پڑے گا و وہ ناقص سبب ہے جس سے دھیرے دھیرے جسم ضعیف ہو جائے گا۔ و ایسے ہی گندا پانی بھی ناقص سبب ہے جو مرض پیدا کرتا ہے۔ ایسے ہی اگر ایک شخص اڑتے پرندے کا شکار کرنا چاہتا ہے تو اس کے پاس کم از کم ایک کمان و ایک تیر ہونا واجب ہے، و ضروری نہیں کہ اس کے پاس اےکے-47 ہو، لیکن اگر ہے تو بہتر ہے، و اگر تیر ہے لیکن کمان نہیں ہے تو سسب ناقص ہے تو وہ شکار نہ کر سکے گا۔ و آخبار میں ہے کہ بضع اصحابِ محمد نے لکڑی کے ڈنڈے سے تلوار بازوں کا مقابلہ کیا ہے، کیونکہ لکڑی سے تلوار کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے گر چہ خطرناک و دشوار ہے، بلکہ محض چاقو یا خالی ہاتھ سے بھی کیا جا سکتا ہے گرچہ خطرناک ہے۔ تو تلوار کے مقابلہ میں لکڑی کا ڈنڈا کافی سبب ہے۔ بر خلاف تیر کمان سے بَمباری کرنے والے ہوایی جہاز کا مقابلہ کرنے کے کہ تیر کمان اس سے مقابلہ کے لیے سببِ ناقص ہیں۔

بحث مذکور سے حاصل ہوا کہ سبب کی تین اقسام ہیں۔ اول سبب کافی جو مقصد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ دوسرا سبب فاضل جو کافی سے زائد ہو، و اس سے کامیابی کا امکان

---

[1] آسموسس عکسی reverse osmosis (RO) پانی چھانے کا ایک طریقہ ہے۔

بڑھ جاتا ہے۔ و تیسرا سبب ناقص جو سبب کافی سے کم ہو، و اس سے مقصد حاصل نہ ہو سکے۔

اگر ہمارے شہر کے کسی شخص کو اچانک سے برفستان منتقل کر دیا جائے تو وہ زندہ نہ رہ سکے گا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وہاں زندہ رہنے کے کافی اسباب سے واقف نہیں مثلا خود کو گرم کیسے رکھنا ہے و کھانا کہاں تلاشنا ہے و وہاں کے خطرناک حیوانات سے کیسے بچنا ہے وغیرہ۔ و اگر وہ ان چیزوں سے واقف ہو جائے لیکن انہیں حاصل نہ کر سکے تو بھی نہ بچے گا۔

اس سے حاصل ہوا کہ بقا کے لیے انسان کو دو اسباب کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک غذا یعنی کھانا پانی و ہوا، و دوسری دفاع خطرناک موسم و وحشی حیوانات و امراض سے، و سب سے بڑھ کے دیگر انسانوں سے۔

ان اسبابِ زندگی میں سے بعض ایسے ہیں جو ہاتھ پیر سے حاصل ہو جاتے ہیں مثلا غذا میں پھل کہ اسے پیڑ سے محض ہاتھ استعمال کر کے توڑا جا سکتا ہے و دفاع میں ہماری کھال جو ہمیں ہلکی دھوپ و ہلکی سردی سے بچاتی ہے۔ لیکن بعض کو حاصل کرنے کے لیے دیگر اسباب کی حاجت ہوتی ہے، و وہ آلات کہلاتے ہیں، مثلا غذا میں گوشت کاٹنے کے لیے چاقو کی و پکانے کے لیے چولہے کی۔ و دفاع میں شدید دھوپ و سردی سے حفاظت کے لیے کپڑے و گھر کی۔ و شکار کرنے کے لیے، جو کبھی غذا کے لیے کیا جاتا ہے و کبھی دفاع کے لیے، نیزہ و تیر و جال و پھندے وغیرہ کی حاجت ہوتی ہے۔ و یہ سب آلات ہیں۔

اس سے حاصل ہوا کہ ایک سسب کو حاصل کرنے کے لیے کبھی دیگر اسباب کی حاجت ہوتی، و کبھی اسے حاصل کرنے کے لیے بھی دیگر کی، و یہ مزید آگے بھی جا سکتا ہے، مثلا ہمیں ایک ہتوڑا بنانا ہے یعنی لوہے کا پھل و لکڑی کا سیدھا دستہ چاہیے، تو آگ کی بھٹی و ہتوڑے و کلہاڑی کی حاجت ہوگی، اول دو کی پھل بنانے کے لیے و کلہاڑی کی دستہ بنانے کے لیے۔ لیکن

کلہاڑی بنانے کے لیے بھی ان ہی آلات کی حاجت ہے، و بھٹی بنانے کے لیے کلہاڑی کی حاجت ہوگی کیونکہ جلانے کے لیے لکڑیاں چاہیے جو پیڑ سے آتی ہے۔ تو اولا ہم نے لگبھگ سیدھی ٹہنی توڑا اور اس میں نوکیلا پتھر باندھا، تو ایک قسم کی کلہاڑی تیاری ہو گئی۔ پھر اس سے لکڑیاں کاٹ کے جمع کیا، تو اب ہمیں بھٹی حاصل ہو گئی۔ پھر اس میں لوہا گرم کیا و پتھر سے پیٹ کے ہتوڑے کا پھل تیار کیا جسے ایک سیدھی ٹہنی سے جوڑ دیا، تو ہتوٹے کی ایک قسم تیار ہو گئی۔ پھر لوہے کو بھٹی میں گرم کرکے و ہتوٹے سے پیٹ کے دھار دار کلہاڑی کا پھل تیار کیا، و ہتوڑے کا پھل بھی بنایا۔ پھر لوہے کی کلہاڑی سے لکڑیاں کاٹا جن سے سیدھے ڈنڈے بنائے، پھر ان سے ہتوڑے و گلہاڑی دونوں میں کے دستے بنائے، تو ہمیں کامل ہتوڑا و کامل گلہاڑی حاصل ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کی حصول آلات خطی نہیں ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ خالص ایک سے دوسرا حاصل ہوا و دوسرے سے تیسرا آگے تک، و نہ ہی متوازی ہے کہ تمام آلات ایک ساتھ متوازیا اپنی ادنی قسم سے تکمیل تک پہونچے ہیں۔ بلکہ بے ترتیب ہے کہ کبھی ایک آلہ ایک سے زیادہ آلات سے حاصل ہوتا ہے، و کبھی وہ جس سے حاصل ہوا ہے اسی پہ اثر ڈالتا ہے کہ اسے مزید درست کرتا ہے و اس کی صلاحیت بڑھاتا ہے، و کبھی خود پر ہی اثر ڈالتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر آلہ کا ایک مادہ و ایک صورت ہوتی ہے۔ مثلا چاقو کا مادہ لوہا ہے و اس کی صورت ایسی ہے کہ آگے دھار دار ہوتا ہے جب کی پیچھے موٹا تاکہ پکڑا جا سکے، و ہتوڑے کا مادہ لوہا و لکڑی ہے و صورت ایسی کہ لکڑی لمبی ہوتی ہے جس میں لوہے کا پھل زاویۂ قائمہ سے جڑا ہوتا ہے۔ و معلوم ہونا چاہیے کہ صورت یا مادہ کے فساد سے آلہ فاسد ہو جاتا ہے یعنی جس مقصد سے بنا ہے اسے حاصل نہیں کر پاتا مثلا لکڑی کا چاقو، و ہتوڑا جس میں پھل و دستہ کا زاویہ قائمہ سے کم یا زیادہ ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم صورت و مادہ کو تبدیل کر نہیں سکتے، بلکہ کہ اگر کوئی دوسرا مادہ یا صورت اس آلہ کی عملی صلاحیت کو ختم نہیں کرتا تو کر سکتے ہیں، مثلا پیتل کا چاقو بنا سکتے ہیں و پانی کا گلاس چاہے لمبا پتلا ہو یا ناٹا موٹا ہو دونوں ہی صورتیں صحیح ہیں۔

مذکورہ کلام سے حاصل ہوا کہ کسی آلہ کی صحت کی شرط اس سے مقصد حاصل ہونا ہے فقط۔ و اس کی فضیلت کی شرط حصول مقصد میں سہولت ہونا ہے فقط۔ مثلا یمن کے لڑاکوں نے لکڑی کا ڈرون بنایا، یعنی پلاسٹک کے پنکھے و لوہے کا موٹر لیکن باقی جسم لکڑی کا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ وہ عمل میں ڈرونِ مروج سے کمتر تھا جو فائبر کا ہوتا ہے، لیکن اڑ سکتا تھا، اوپر سے تصویر کھینچ سکتا تھا، تو اگر اسے بنانے کا مقصد یہی تھا تو حاصل ہو گیا یعنی وہ ڈرون آلۂ صحیح ہے۔ لیکن اگر مزید ایسی توقع بھی رہی ہوگی جو وہ ادا نہیں کر سکا تو فاسد ہے، تب لکڑی کا استعمال درست نہیں ہوگا بلکہ کسی اور چیز کا استعمال کرنا ہوگا۔

اب تک ہمیں جو حاصل ہوا وہ یہ ہے کہ بعض کام ایسے ہیں جو بنا آلات کے نہیں ہو سکتے خواہ وہ غذا کا انتظام ہو یا مرض و دشمن سے دفاع۔ و آلات دو طرح حاصل ہوتے ہیں۔ یا تو دوسرے سے لے کے خواہ چھین کے یا مانگ کے یا خرید کے۔ و اگر دوسرے سے نہ مل سکیں تو ان کے مادات کا انتظام کرنا ہوگا و ان مادات سے اسے بنانے کا علم بھی حاصل کرنا ہوگا پھر خود اسے بنانا ہوگا، گرچہ اس میں زیادہ دشواری ہے لیکن کوئی چارہ بھی نہیں۔ و اگر ان کے مادات بھی حاصل نہ ہو سکیں تو ان مادات کے مادات حاصل کرنا ہوگا پھر بنانے کا پورا علم حاصل کرنا ہوگا و بنانا ہوگا، ظاہر ہے کہ اس میں مزید دشواری ہوگی، و ایسے ہی آگے تک جائے گا۔ لیکن مادات بسیط مثلا لوہا و لکڑی وغیرہ بنائے نہیں جاتے بلکہ اپنے ماخذ سے پائے جاتے ہیں یعنی لوہا کان سے و لکڑی درخت سے وغیرہ۔ و ایسے ہی وہ آلات جو دیگر آلات بنانے میں کام آتے ہیں، ان کے حصول کا بھی وہی طریقہ ہے جو گزرا۔

تو جو کسی آلہ کو بازار میں نہیں پاتا و قاعدۂ مذکور سے واقف بھی نہیں ہے، یعنی آلات حاصل کرنے کے مذکورہ طریقہ سے، تو وہ گمان کرتا ہے کہ اس آلہ کو حاصل کرنا نا ممکن ہے مثلا ہوائی چکی[2] و توپ وغیرہ۔ جب کہ جسے طریقہ معلوم ہے اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ یہاں الہ آباد میں کئی ہاسٹل ہیں جہاں جامعۂ الہ آباد میں پڑھنے والے پردیسی طلبہ قیام

[2] ہوائی چکی wind mill بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

کرتے ہیں۔ برابر خبر آتی ہے کہ پولیس نے چھاپا مارا و بم برامد کیا وغیرہ۔ اب وہ یہاں پڑھنے آتے ہیں یا گنڈا بننے یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن یہ واضح ہے کہ ان کے لیے بم بنانا مشکل نہیں کیونکہ انہیں اسے بنانے کا علم ہے و یہ علم بھی ہے کہ اس کا مادہ کہاں ملے گا۔ ایسے ہی حماس، جو اھل فلسطین کے باشندوں کی ایک جماعت ہے و ابھی اسرائیل سے جنگ لڑ رہی ہے، نے ایک ویڈیو جاری کیا جس میں انہوں نے ایسے ہتھیار بنانے کا کارخانہ دکھایا جس سے وہ امریکا و اسرائیل کے ہتھیاروں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ و ظاہر ہے کہ وہ اتنا تو نہیں بنا سکتے کہ اسے فروخت کر کے مال کمائیں، لیکن اپنی حاجت بھر تو بنا ہی رہے ہیں۔ ان مثالوں سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ جب انسان کو کوئی چیز حاصل کرنے کا طریقہ معلوم نہیں ہوتا تو وہ اس کو نا ممکن سمچھتا ہے و جب کوئی دوسرا حاصل کر لیتا تو وہ بڑا حیران ہوتا ہے۔ و ہتھیار کی مثال ہم نے اسی لیے دیا کیونکہ عام لوگوں کے لیے وہ بالکل نایاب ہوتا ہے۔

میں سائنس و کمپیوٹر کا طالب ہوں و اپنے ذاتی استعمال کے لیے موبائل ایپ بنائی ہے۔ لیکن موٹر وغیرہ و سائنس کی دوسری چیزیں کبھی نہیں بنائی کیونکہ مجھے ان کے مادات حاصل نہیں تھے و نا ہی وہ آلات حاصل تھے جن کی استعانت کی حاجت پڑتی۔ جب کہ ایپ بنانے کے لیے دونوں ہی چیزیں تھی، اسے بنانے کا آلہ جاوا[3] و اس کے مادات یعنی وہ اصول و احکام جو اس میں عبارت سے تعبیر کیے جاتے ہیں، بس ان عبارات کو ترتیب دینا تھا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی بھی چیز جو انسانی سماج میں ہے، خواہ جسم ہو یا علم، تو اسے پانے کا افضل طریقہ ہے مال، یعنی اکثر امکان ہے کہ مال کے بدلے میں مل جائے گی کیونکہ انسان کی لالچ کی کوئی منتہا نہیں ہے۔ و مال لوٹ کے آتا ہے جیسے عرب ریگستان میں رہنے والے فقیر تھے پھر انہوں نے جنگیں کیا و لوٹا تو امیر ہو گئے، و مانگول بھی برفستان میں رہنے والے فقیر تھے پھر جنگیں گیا و لوٹا تو امیر ہو گئے، و ایسے ہی انگریزوں نے جب بھارت کو لوٹا تو بے تحاشہ دولت پائی، و ایسے ہی امریکا نے بھی ایراق و لیبیا میں لوٹ پاٹ کیا و

---

[3] جاوا java کمپیوٹر کی ایپ بنانے کا ایک آلہ ہے۔

طویل مدت تک تیل چرایا جس کا نتیجہ ہوا کہ اس نے خوب دولت کمائی۔ تو جو فوج اس قاعدہ سے واقف ہوتی وہ آسانی سے دشمن کا سامنا کرتی ہے۔

لیکن یہ طریقہ صرف جنگ میں جائز ہے، یعنی دشمن کو لوٹنے میں۔ سماج میں ایسا کرنا ممکن نہیں کیونکہ اگر کسی نے ایسا کیا تو سماج اس کا دشمن بن جائے گا و اسے سزا دیگا۔ جس کو لوٹا وہ تو دشمنی کرے گا کیونکہ اس کا نقصان ہوا ہے، و دوسرے لوگ بھی کریں گے کیونکہ یہ کل انہیں بھی لوٹ سکتا ہے۔ و ایسے عمل کو، جو سماج کو خراب کرے، جرم کہا جاتا ہے۔ پھر اس کی انواع ہیں مثلا چوری یعنی کسی سے اجازت کے بنا اس کا کوئی سامان لے لینا، گالی یعنی کسی کو بری اوصاف کے ساتھ متصف کرنا، نا حق پیٹنا، نا حق قتل کرنا۔ نا حق کی شرط لگانا ضروری ہے کیونکہ کبھی یہ عمل جائز بلکہ ضروری ہو جاتے ہیں و تب انہیں کرنا برا نہیں ہوتا بلکہ اچھا ہوتا ہے۔ مثلا اگر ایک آدمی ہے جو لوگوں کو پریشان کرتا و منع کرنے پہ نہیں مانتا تو واجب ہے کہ اس کو پیٹا جائے تاکہ وہ بدماشی چھوڑ دے۔ و ایک آدمی ہے جو لوگوں سے چھگڑتا ہے یہاں تک کہ انہیں نا حق قتل کر دیتا ہے تو واجب کہ اسے قتل کیا جائے تاکہ بے قصور لوگوں کی جانیں نا جائیں۔

گزشتہ بحث سے حاصل ہوا کہ ظالم خواہ ایک آدمی ہو یا ایک جماعت، یا کوئی فوج ہو یا پورا ملک، و مظلوم خواہ کوئی ہو، تو اسے روکنا واجب ہے۔ پھر اگر ہمارا ان پہ اقتدار ہے تو سزا دیں گے، ورنہ جنگ کے علاوہ کوئی چارا نہیں۔ و یہ جہادِ ہجومی کی سب سے بڑی عقلی دلیل ہے۔ و اگر مظلوم ہم ہی ہیں تب تو جنگ ہی ایک راستہ ہے۔ و یہ جہادِ دفاعی کی سب سے بڑی دلیل عقلی ہے۔ و اصل ہے جنگ کا کہ اگر ہم قوی ہیں تو لڑنا ہے، و اگر ضعیف ہیں تو قوت بنانا ہے۔

اگر جنگ کی بات کریں تو سونتسو نے فن جنگ[4] پہ اچھی کتاب لکھا ہے۔ خیر جنگ کے لیے سب سے اہم ہے تیاری، مثلا اگر چین ہند پہ حملہ کرے و فوجِ ہند کو شکست دے دے، تو وہ

[4] میں نے فن حرب کا اردو ترجمہ کیا ہے لیکن وہ انگریزی سے ہے۔

آسانی سے ہمارے اوپر اقتدار پا لے گا، یعنی ہم اس کے غلام ہو جائیں گے کیونکہ ہماری اس سے لڑنے کی کوئی تیاری نہیں ہے، بلکہ تمام اعتماد محض وطن کی فوج ہے۔ تو جب دشمن ہمارے گھر کے دزوارے پہ کھڑا ہوگا تو اس سے کیسے پچنا ہے سمجھ میں نا آئے گا۔ لہذا کہا سونت سو نے ہمیں دشمن کے نا آنے کی امید نہیں رکھنا ہے بلکہ اس سے لڑنے کی کامل تیاری رکھنا ہے، و اس کے حملہ نا کرنے کے امکان کی امید نہیں رکھنا ہے بلکہ اپنا مقام غیر دست یاب رکھنا ہے۔

خوب یاد رکھنا کہ ہم پر کسی قوم کے اقدار پانے کا معنی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ جو چاہیں کریں، ہم انہیں کچھ بول نہیں سکتے کیونکہ جو بھی بولے گا وہ مزید سخت سزا پائے گا۔ اس کی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے جن میں سے چند ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں۔ جب مانگول کسی ملک پہ قابض ہوتے تو وہاں قتل عام کرتے و تین چوتھائی آبادی ختم کر دیتے تھے تاکہ لوگ بغاوت نہ کر سکیں۔ و جب سرب نے باسنیا پہ قبضہ کیا، تو چشم دید گواہوں کے مطابق سرِ عام جس کو چاہتے قتل کرتے تھے، 8000 سے زیادہ مرد و جوان قتل کیے گئے، جس حاملہ کو چاہتے پیٹ پھاڑ کے بچہ نکال لیتے، اغتصابی کیمپ بنائے گئے تھے جہاں عورتوں کو سالوں تک قیدی بنا کے ان کا اغتصاب کیا جاتا و جب تک حاملہ نہیں ہوتیں تو چھوڑا نہیں جاتا۔ اغتصابات کے کل عدد کا اندازہ 20،000 سے 50،000 تک لگایا گیا ہے۔ اجتماعی و عوامی اغتصاب بھی شاذ نہیں تھے، یہاں تک کہ بچی سے بڑھیا تک جس کا چاہتے اغتصاب کرتے، گر چہ بچیوں کی اواز فضاء میں گونجتی لیکن کوئی بولنے والا نہیں تھا کیوں اس کی سزا موت تھی۔ یہاں سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ یہ اقوام متحدہ کے ذیر نظر ہوا، ان کے سپاہ وہاں تھے لیکن کچھ کیا نہیں، امریکا و برطانیہ کے پاس اس سے زیادہ طاقت و فوجیں تھیں جو اس جرم کو روکنے کے لیے مطلوب تھیں، لیکن کسی نے کچھ نہیں کیا۔ جرم کی یہی داستاں نانچنگ کی ہے جب جاپان نے اس پہ قبضہ کیا تھا، 40،000 سے زیادہ قتل و 20،000 سے 80،000 تک اغتصابات کیا۔ ایسے ہی کنن پوشپورہ کشمیر میں بھارتی فوج تفتیش کے بہانے سے مردوں کو گھروں سے نکال کر دور لے گئی و صبحہ تک وہیں رکھا۔ و پوری رات ان کے گھروں میں ان کی عورتوں کی آبرو لوٹی، مظلوموں کے بیان ہیں کہ ان کی ماں و ان کی

بیٹیوں کے سامنے برہنہ کر کے ان کی عزت لوٹی جاتی، اجتماعی اغتصاب بھی ہوئے۔ جب صبح وہ لوگ اپنے گھر لوٹے تو اس دردناک واقع کی خبر ہوئی۔ پھر جب انہوں نے حکموت سے شکایت کیا تو اس نے و فوج نے بعد تحقیق کے اس جرم کو یہ بول کے نکار دیا کہ اس کی دلیلیں ناکافی ہیں و یہ دشمنوں کی سازش ہے فوج کو بدنام کرنے کی۔ لیکن حقوق انسانی کی عالمی تنظیمات نے اس فوجی تحقیق کو رد کیا، و اس بات کی تصدیق کیا کہ 23 سے 100 کے درمیان اغتصابات ہوئے ہیں۔ ایسے ہی قبطی بنو اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے و لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ جب انگریزوں نے سلطنت اسلامی ختم کر کے بھارت پہ قبضہ کیا۔ تو علمائے اسلام نے بڑی شجاعت سے ان کے خلاف بغاوت کیا و جنگِ 1857 کیا، جس میں تقریبا 2،00،000 لوگ، جن میں 50،000 علمائے اسلام، قتل کیے گئے کیونکہ وہ اس واقع کے لیے پہلے سے تیار نہیں تھے، گرچہ شجاعت سے بھرے تھے۔ لیکن جو لڑتا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو ڈرتا ہے، کہ ظالم کی چوٹ تو سب چھیلتے ہیں لیکن لڑنے والے دشمن کو بھی چوٹ دیتے ہیں و ایک دن نجات پاتے ہیں جیسے افغانستان نے بھی ما تحت امریکا بڑا قتل عام و آبروریزی دیکھا لیکن ان کی ایک جماعت طالبان نے آخر تک امریکا سے جنگ کیا، یعنی جب تک وہ چلا نہیں گیا، یہ لوگ تھے جنہوں نے خوشی سے موت کو گلے لگایا لیکن چھکے نہیں تو آج ان کی زمین خبیثوں سے رہا ہو گئی اس پہ خدائی شریعت نافذ ہے و تھوڑے عرصہ میں بڑی ترقئ اقتصادی و عسکری حاصل کی ہے۔ و آخرت میں ان لوگوں کے لیے بہترین بدلہ و بڑا مقام ہے۔

لیکن تیاری سب کچھ نہیں ہے، بلکہ شجاعت بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ جب موسی نے بیت المقدس کی آزادی کے لیے بنو اسرائیل کو کنعانیوں سے جنگ کرنے کو کہا، تو انہوں نے بزدلانہ جواب دیا کہ تم و تمہارا رب جا کر لڑو پھر جب تم فتح کر لوگے تو ہم آجائیں گے۔ یہ اس لیے کیونکہ ان کے اندر موت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی، جبکہ کوئی جنگ ایسی نہیں جس میں جان کا خطرہ نہ ہو۔ بلکہ دنیا میں کوئی منزل جان یا مال کا خطرہ اٹھائے بنا حاصل نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ہمارے ترقی یافتہ شہروں میں بھی جان جانے کا خطرہ ہوتا بوجہ حادثات یا دشمنی کے۔ و تجارت میں مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے حادثات مثلا آگ لگنے

سے و چوری ہونے سے و تجار کے دھوکا دینے سے وغیرہ۔ یہاں تک کہ ایک حصہ مال کا ضائع ہو ہی جاتا ہے پرانا ہونے کی وجہ سے یا اس میں عیب ہونے سے وغیرہ۔ یہاں تک کہ کسان جو اپنا کھیت جتواتا ہے پھر اس میں فصل لگواتا ہے پھر پورے موسم اس میں پانی و کھاد ڈلاتا ہے و چرندوں سے اس کی رات دن حفاظت کراتا ہے، وہ بھی خطرہ اٹھاتا ہے، کیونکہ ان چیزیں میں کافی خرچ ہوتا ہے، و کبھی کوئی بلیٰ اس کی پوری فصل خراب کر دیتی ہے مثلا خراب موسم یعنی بے وقت سوکھا یا بارش، یا ٹڈی وغیرہ۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ بڑے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہمت واجب ہے۔ لیکن اگر ناکامی یقینی ہو یا اس کا ظنِ غالب ہو تو اس کے لیے خطرہ اٹھانا خودکشی کرنا ہے، و ایسا خطرہ اٹھانا جو بے نفع ہو تو حماقت ہے۔ و ہمتِ کامل پیدا ہوتی جب جان و مال کے مفقود ہونے کا خوف ختم ہوتا ہے، و منزل مقصود کے حاصل ہونے کی خوب امید ہوتی ہے۔ و یہ چیز ہے جو حب اللہ و توکل علی اللہ سے پیدا ہوتی ہے، کہ جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے و اس کی رضا چاہتا ہے تو موت کو ایسے پسند کرتا ہے جیسے شرابی شراب کو، و جو شخص اللہ پہ توکل کرتا تو بد سے بدتر حالات میں بھی ثابت قدم رہتا ہے کیونکہ بگڑے حالات اس کی امید توڑ نہیں پاتے کیونکہ جانتا ہے کہ ہونا تو وہ ہے جو اللہ نے مقدر کیا ہے، خواہ اجھا ہو یا برا۔ وہ بندۂ مومن ہے جس کا ہر کام ہر بڑھتا قدم اس کے رب کی رضا کے لیے ہوتا ہے۔ یہی وجہ کہ 313 اصحاب محمد نے 1000 افراد کے لشکرِ قریش کو شکست دیا۔ و اپنے سے قوی طاقت روم و فارس کو نیست نابود کیا۔

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی جو سخت شکست ہوئی تھی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے امیر کے حکم کی نافرمانی کی تھی، گرچہ غلطی سے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ قتلِ نبی کی افواہ اڑی جو مزید افرا تفری کا باعث بنی۔ اس میں دو اہم سبق ہیں اس قوم کے لیے جو موت کے دہانے پہ کھڑی ہو، ایک تو یہ کہ اس کو جلد سے جلد امیر کا انتخاب کر لینا چاہیے و دوسرا یہ کہ اس کی اقتدا کرنا چاہیے۔ امیر میں چار اوصاف ہونی چاہیے سختی و شجاعت و احسان و اخلاص۔ اگر سختی سے حکم نافذ نہ کر سکے گا تو قوم

منمانی کرنے لگے گی، و اگر شجاع نا ہوگا تو خطرہ نہ اٹھا سکے گا یعنی قوم کو ہلاک کر دے گا کیونکہ بڑے مقصاد خطروں کا سمنا کر کے ہی حاصل ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے گزرا، و اگر محسن نہ ہوگا تو قوم میں بغاوت کو نہ روک سکے گا، و اگر مخلص نا ہوگا تو ذاتی مفاد ختم ہونے پہ قوم کو پیچھے چھوڑ کے بھاگ جائے گا۔ و اقتدا کی اصل یہ ہے کہ تم امیر کا حکم مانو گرچہ اس سے زیادہ عقل مند ہو۔ و یہ اس لیے کیونکہ قوم کے حالات وہ تم سے زیادہ جانتا ہے کیونکہ ہر چیز ہر شخص نہیں جان سکتا لہذا ایک امیر بنایا جاتا ہے جو قوم سے متعلق اندرونی بیرونی تمام خبر رکھے۔ و کیونکہ پوری قوم اس کی اقتدا پہ متفق ہے، تو اگر تو اس کے خلاف جائے گا تو یا اکیلا ہو جائے گا جس کا کوئی فائدہ نہیں یا ایک فریق تیرے ساتھ ہو جائے گا جو مزید برا ہے، کیونکہ اگر پوری فوج لڑے یا پوری فوج بھاگ جائے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ آدھی لڑے و آدھی بھاگ جائے۔

تیسری بات کہ مقام جنگ کے لیے مناسب ہونا چاہیے۔ اسی لیے سونت سو نے کہا ہے کہ زمین کی جنگ میں آگے دشمن و پیچھے دریا نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس سے دہشت حاوی ہوتی ہے و حوصلہ ختم ہو جاتا ہے۔ روم سے جنگ میں ایسا ہی ہوا تھا کہ خالد بن ولید نے ایک ٹکڑی بھیج کے پیچھے دریا پہ بنے پل پہ قبضہ کر لیا تھا جس سے رومیوں کی امداد کا راستہ بند ہو گیا تھا، اس جنگ میں اہل روم کو بڑی شکست ہوئی تھی۔ و افغانستان کے پہاڑوں میں چھپ کر ہی طالبان امریکا سے لڑنے پہ قادر ہو پائے تھے۔ لیکن سب سے حیرت انگیز تو وہ ہے جو حماس نے کیا کہ زمین کے نیچے لمبی سرنگیں کھود ڈالا کیونکہ فلسطین سحطی ہے وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں۔ و اس میں بڑا سبق ہے کہ اگر کھیل کا میدان مناسب نہیں ہے تو اسے مناسب بنانا ہے چاہے کیسے بھی، تبھی اس میں باقی رہا جا سکتا ہے۔

و خبر کی اہمیت کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلا اگر چین یا کوئی اور دشمن ہم پہ حملہ کرنے والا ہے و ہم اس سے بے خبر ہیں تو مصیبت لازم ہے۔ و مثلا اگر ہمارے ساتھی کے جملے اس کے عقد کے خلاف ہیں یا اس کے اعمال اس کے جملوں کے خلاف ہیں تو مطلب ہے کہ وہ دھوکا دے رہا، اس میں بالکل لاپرواہی نہیں کرنا چاہیے، و پہلے دھوکے میں خبردار ہو

جانا چاہیے عمل کرتے ہوئے محمد کے قول پہ کہ مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ ڈسا نہیں جاتا۔ و فورا اسے سخت سزا دینا چاہے تاکہ دو بارہ ہمارے خلاف جانے کی ہمت نا کرے ورنہ آگے وہ مزید بڑی شرارتیں کرے گا۔

دشمن کی عدم اطلاع وہ چیز ہے جس نے مانگول کو زبردست کامیابی دلائی کہ ان کا ایک فوجی اپنے ساتھ مزید چار پانچ گھوڑے لے کر چلتا تھا، جب اس کا گھوڑا تھک جاتا تو اسے بدل دیتا، تو وہ لوگ ہمیشہ وقت سے پہلے مسافت تہ کر لیتے و بے خبر دشمن کو آچانک بلا تیاری پکڑ لیتے تبھی کہا ہے سونت سو نے کہ جنگ میں حماقت ہے جلد بازی میں، لیکن کبھی نہیں دیکھا گیا عقل مندی کو تاخیر میں۔ جیسے ہمارے لیے خبر صادق حاصل کرنا واجب ہے، ویسے ہی دشمنوں کو اخبار کاذب میں پھسانہ واجب ہے، تاکہ ان کی کوششیں بے نفع ثابت ہوں و ان کی محنت و مشقت سب ضائع ہوں، و وہ خود ہی مشکل میں آئیں۔ و یہ کام جاسوسوں کا ہے جن کی پانچ اقسام ہیں جہیں بیان کیا ہے سونت سو نے۔ خیر فارس سے جنگ میں مسلمانوں کو اولا بھاری نقصان ہوا تھا و فارس کے فوجی ہاتھیوں نے ان پہ چڑھائی کر دی تھی کیونکہ ان سے لڑنے کا طریقہ وہ نہیں جانتے تھے۔ پھر انہوں نے ایک مہاوت کو پکڑا تو اس نے بتایا کہ ہاتھی کے آنکھ پھوڑو و سونڑ کاٹو تبھی اس کو مار سکتے ہو۔ تو مسلمانوں نے ایسا ہی کیا و شکست فتح میں بدل گئی۔ یہاں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اگر ان کو یہ بات پہلے سے معلوم ہوتی تو جو نقصان ہوا وہ نہ ہوتا۔ لہذا یہ سبق یاد رکھنا کہ راستہ چلنے سے قبل و راستہ چلنے کے دوران آینده حالات کو معلوم رکھنا۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا کہ حالات بدلتے رہتے ہیں تو جتنا ممکن ہو اہم امور کی اخبار کی تجدید کرنا۔ پھر یاد رکھنا کہ کبھی خبر لانے والا دھوکا دیتا ہے، و کبھی وہ خود ہی دھوکا کھا جاتا ہے۔ لہذا اہم امور میں جہاں ممکن ہو دو مختلف مصادر استعمال کرنا کیونکہ جب دونوں صادق ہوں گے تو دونوں کی خبر یکساں ہوگی لیکن اگر کوئی ایک بھی جھوٹ بولے گا یا خطا کرے گا تو دونوں کی باتیں مختلف ہوں گی، پھر تو اپنے خواص سے تحقیق کرا سکے گا۔ کبھی حالات جو دکھتے ہیں وہ ہوتے نہیں و جو ہوتے ہیں وہ دکھتے نہیں، و اس کی تحقیق مشکل ہے جو خالص طویل

مدت تک نظر رکھ کر ہی حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ ناٹک ہمیشہ تک نہیں چلتا و خطا ہونا اس میں ضروری ہے۔

آلہ کی ایک قسم آلۂ نظری ہے۔ اس کا مادہ معلومات ہیں، و صورت ان معلومات کی ترکیب ہے۔ مثلا منطق، ہندسہ، حساب جبر وغیرہ، و ان سب کے اپنے مقاصد ہیں۔ منطق کا مقصد ہے دلائل کی معرفت یعنی ان کے صحیح و فاسد و یقینی و ظنی ہونے کی، ہندسہ کا مقصد مقدار کی پیمائش ہے، و حساب جبر کا مقصد اولا، یعنی جب خوارزمی نے اسے وضع کیا تھا، تو تقسیم میراث تھا لیکن آج بہت وسیع ہے۔ و یہی حال اب منطق و ہندسہ کا بھی ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بہت سے آلات نظری ایسے ہیں جو وضع تو کسی چیز کے لیے ہوئے لیکن کام دوسری چیزوں میں بھی آئے مثلا منطق و جبر کمپوٹر کے اساسیات بن گئے، و صناعتِ احتمال[5] وہ آلہ جس کو جوا میں کامیابی کے امکان کو جاننے کے لیے وضع کیا گیا تھا، لیکن آج عقل صناعی[6] کے اساسیات میں سے ایک ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ علوم نظری گرچہ کتنے بے فائدہ معلوم ہوں انہیں چھوڑنا نہیں چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ کل ان کا مفاد ظاہر ہو، و تب وہ جس کے ہاتھ ہوں گے وہی نفع اٹھائے گا۔ و معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری زبان جو ہم بولتے ہیں وہ بھی ایک صناعت ہے، ایک آلہ ہے، جس کا مقصد ہے افکار کو دوسروں تک پہونچانا۔ و زبان بنی ہوتی ہے الفاظ سے، جن کی ترکیب سے کبھی خبر دی جاتی ہے مثلا "زید آیا" و کبھی سوال کیا جاتا ہے مثلا "کیا زید آیا" و کبھی امر کیا جاتا ہے جیسے "آو"، پھر ان میں سے ہر ایک کی اقسام ہیں۔ خیر، زبان کی اس قسم کو زبانِ طبیعی کہتے ہیں کیونکہ یہ بالطبع انسانوں کی آبادی میں پیدا ہوئی ہیں۔ و زبان صناعی وہ ہے جو انسان نے بالاختیار بنایا ہے ویسے جیسے ہندسہ و منطق بنایا ہے۔ جس کی چند امثلہ یہ ہیں؛ منطق رمزی[7] کی زبان جس میں قضایا کو حروف ہجاء و بعض رموزِ مخصوص سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلا ∀ حـ(حب←حج)، و اس کا معنی ہے "ہر حـ جو ب ہے تو وہ ج ہے" یعنی "ہر ب ج ہے"؛ کیمیائی

---

[5] صناعت احتمال یعنی Probability Theory۔

[6] عقل صناعی artificial intelligence یعنی سوچنے والی مشین۔

[7] منطق رمزی یعنی Symbolic Logic اس کے اس نام کہ وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر چیز کو محض ایک حرف و رمزی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

زبان سے مراد علم کیمیاء میں استعمال ہونے والی زبان ہے مثلا[8] 2ھ$_2$+آ$_2$←2ھ$_2$آ، اس کا معنی کافی طویل جو اس عبارت میں اختصارا تعبیر ہے؛ ایسے ہی کمپیوٹر کی زبان ہے جس میں ہم خالص دو اشارات استعمال کرتے ہیں، و ان کے غیر متناہی تکرار و ترکیب سے ہر لفظ و عدد و ہر چیز پہ دلآلت کرتے ہیں و ان دونوں اشارات کو صفر و ایک سے تعبیر کرتے ہیں، مثلا 1001 کا معنی 9 ہے۔ واضح رہے کہ زبانان مصنوعی نہایت اہم ہیں، کیونکہ تعلیم و تعلم کے لیے امور کی صحیح و واضح تعبیر بہت ضروری ہے، جو بعض جگہ خاص زبان صناعی کے بنا کافی مشکل ہوتی ہے۔

معلوم رہے کہ ہر انسان کے لیے ہر آلات، دونوں نظری و خارجی، حاصل کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ مثلا ایک باورچی کو دوربین کی کیا ضرورت و ایک مہندس کو فقہ کی کیا ضرورت۔ یہاں خارجی سے میری مراد وہ ہے جو ذہن سے باہر ہے، و اسے عملی کہنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ نظری کو بھی ہم عمل میں لاتے ہیں۔ بس حسبِ ضرورت حاصل ہونا کافی ہے۔ چنگیز جس نے دنیا فتح کیا وہ جنگی امور میں مہارت رکھتا تھا جب کہ باقی علوم سے خالی تھا۔ تو ایک آدمی کو خالص اپنے پیشہ کا علم ہونا کافی ہے۔ لیکن ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو علوم کو اس کی غایت قصوی تک حاصل کرنے والی ہو تاکہ اس علم میں مزید ترقی ہو سکے، جو باتیں اس میں باطل ہیں و جو صحیح ہیں ان کی تحقیق ہو سکے۔ و لوگوں کا ایک طبقہ کثیر علوم کو حاصل کرنے والا ہوتا ہے، و ایسے لوگوں کو جامع العلوم کہتے ہیں، و علوم کے اجتماع کا جو مفاد ہے وہ بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ و اسی طرح دیگر آلات میں، خواہ نظری ہوں یا خارجی، لگتار تغیر و ترقی ہوتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ کبھی جدید حاجات و کبھی مزید سہولت کی طلب ہوتی ہے۔ و حاجات ہی کی وجہ سے جدید آلات بھی ایجاد ہوتے ہیں مثلا طویل سفر جلدی تمام کرنے کے لیے ریل گاڑی و ہوائی جہاز بنائے گئے۔ لیکن خالص حاجت کافی نہیں ہے بلکہ یہاں دو شرائط بھی ہیں ایک مناسب مادہ موجود ہو و دوسری صناعت کا طریقہ معلوم ہو۔ آج انسان ستاروں کے بارے میں کافی جانتا ہے وہاں جانا بھی

---

[8] چونکہ کتاب اردو میں ہے لہذا یہ مساوات بھی میں اردو میں لکھا ہے۔ خیر انگریزی میں ہوگی $2H_2+O_2\rightarrow 2H_2O$ ، مگر میں ان تعبیرات کو بھی اردو پسند کرتا ہوں۔

چاہتا ہے، لیکن وہ ہزاروں نوری سال کی دوری پہ ہیں، و ایک نوری سال وہ دوری ہے جو نور ایک سال میں تمام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تارا ہمیں جہاں دکھائی دیتا ہے وہاں ہوتا نہیں کیونکہ اس کا نور جو ہماری آنکھ میں پڑتا ہے وہاں سے ہزاروں سال پہلے چلا ہے۔ خیر وہاں جانے کے لیے ہمیں جو سواری چاہیے وہ بن سکتی ہے یا نہیں، ہم نہیں جانتے و جب تک بن نا جائے ہم جان بھی سکتے۔ یہاں تک کہ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ موجودہ مادات سے اسے بنانا ممکن ہے یا نہیں و نہ ہی یہ معلوم ہے کہ ہم اسے بنانے کا طریقہ جان سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن بنانے کی امید رکھنا واجب ہے کیونکہ تبھی ہم اسے بنانے کی کوشش کریں گے ورنہ تو گوشش ہی نہیں کریں گے تو وہ کبھی بن ہی نہیں پائے گا۔ خیر صناعت نظری میں سے ایک علمِ سماج ہے جس کی غرض سماج کے بارے میں سمجھنا ہے تاکہ اسے بہتر بنایا جا سکے۔

سماج انساوں کی وہ آبادی ہے جو ایک ساتھ رہتی ہے و آپسی تعاون سے اسباب زندگی حاصل کرتی ہے۔ و اس میں مختلف کام مختلف لوگوں میں تقسیم ہوتا ہے مثلا زراعت، تدریس، سلائی، وغیرہ کیونکہ ہر شخص ہر کام نہیں کر سکتا۔ و یہی وجہ کہ گرچہ ایک شخص ہر چیز میں مہارت نہیں پا سکتا لیکن ایک قوم پا سکتی ہے اس طرح سے کہ بعض چیزوں میں بعض لوگ ماہارت حاصل کریں و دیگر میں بعض، یہاں تک کہ کوئی بھی پیشہ، مثلا زراعت و طب و فقہ وغیرہ، ایسا باقی نہ رہے جس کے ماہر اس قوم میں نہ ہوں۔

ہر انسان کو دو قسم کی حاجت ہوتی ہے یا تو کسی سمان کی یا کسی خدمت کی۔ لہذا جب ایک شخص کسی کو کچھ دیتا ہے یا اس کے لیے کچھ کرتا ہے تو قیمت میں کچھ لیتا ہے یا کچھ کراتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے انسانی سماج نے ترقی کیا تو ادلا-بدلی کا نظام نقد سے بدل گیا کیونکہ اس میں دشواریاں تھیں مثلا ہم نے کسی سے گوشت لیا و بدلے میں دھان و پھل پیش کیا لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کو ان چیزوں کی حاجت نہیں تھی۔ تو اب ہمارے پاس دو راستہ ہے یا تو اس کا سامان اسے واپس کر دیں لیکن تب ہماری حاجت کا کیا ہوگا، یا پھر اسے قرض لے لیں بعد میں قیمت ادا کرنے کے نام پہ، لیکن یہ خطرناک ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ہم وعدہ سے مکر جائیں یا بھول جائیں۔ تو راسطہ لیا کتابت و گواہی کا

یعنی جو قرض دیا جائے تو اسے لکھوایا جائے و اس پہ کسی امین شخص کو گواہ بنایا جائے۔ لیکن اس میں بھی مشکل ہے کہ یہ کام بڑے لین دین میں تو ممکن ہے، لیکن عوام کے درمیان ہونے والے روز مرہ کے چھوٹے بڑے لین دین چونکہ غیر متناہی ہیں، تو ان میں ممکن نہیں ہے۔ تو اس کا حل تھا ایک ایسی چیز جس سے ہر چیز بدلی جا سکے و اس کا نام رکھا نقد۔ و اب نقد کے کام کرنے کا طریقہ ذکر کریں گے۔ زید عمرو کے پاس گیا و اس سے آدھا کلو دال لیا ایک کلو چاول کے عوض میں، لیکن اس کے پاس اس وقت چاول نہیں تھا تو ایک کاغز پہ لکھ کے دے دیا کہ "اس کے بدلے ایک کلو چاول دوں گا" تو یہ کاغذ مثل نقد کے ہو گیا۔ پھر عمرو نے خالد سے کچھ لیا ایک کلو چاول کے بدلے، لیکن چاول کے بجائے وہ کاغز دیا، لیکن خالد نے اسے لینے سے انکار کیا کیونکہ اگر زید نے اس کاغز کی تصدیق سے انکار کر دیا تو وہ محض کوڑا رہ جائے گا جس سے خالد کا نقصان ہو حائے گا۔ لہذا اگر عمرو وہ کاغذ چلانا چاہتا ہے تو اس کی تصدیق کے لیے زید کو بلانا پڑے گا۔ ایسے ہی خالد اگر اسے چلانا چاہے گا تو اسے بھی زید کو بلانا پڑے گا۔ و ظاہر ہے یہ بار بار ممکن نہیں۔ تو اس کا خالص ایک ہی حل ہے کہ حکومت اس کاغذ پہ مہر لگا دے یعنی اس کے صادق ہونے کی ضمہ داری لے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر زید نے اس کاغذ کے بدلے چاول نا دیا تو حکومت دلائے گی، تو اب کوئی بھی اسے لینے میں نہ چھجکے گا۔

بحث مذکور سے حاصل ہوا کہ نقد کی بذات خود کوئی قیمت نہیں ہے۔ وہ بس حکومت کی مہر لگی ہوئی ایک چیز ہے جس کے بدلے ہم دوسرے شخص سے سامان یا خدمت حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر دوسرا نہ دے تو تیسرا دے گا، و تیسرا نہیں تو چوتھا دے گا۔ یعنی ممکن ہے کہ بعض افراد انکار دیں لیکن سماج دے گا جب تک کہ حکومت انکار نہ کر دے۔ کہا جا سکتا ہے کہ نقد سماج پہ قرض کی دلیل ہے یعنی ہمارے پاس نقد ہے تو مطلب ہوا کہ ہم نے سماج کے لیے کچھ کیا ہے، و اسی لیے ہم اس سے کچھ کرا سکتے ہیں۔ و اگر حکومت نقد کی ضمہ داری چھوڑ دے تو وہ محض ردی رہ جائے گا جسے کوئی نہ لے گا۔

و تدریج سماجی[9] سے مراد ہے سماج کے افراد کی درجہ بندی۔ تو معلوم رہے کہ سماج میں بعض لوگ بعض سے افضل ہوتے ہیں، و بعض گروہ بعض سے افضل ہوتے ہیں مثلا اطباء کی مزدوران پہ فضیلت، و علماء کی عوام پہ فضیلت۔ لیکن کبھی بعض کو دیگر پہ نا حق فضیلت دی جاتی ہے مثلا نسب و برادری کے بنا پہ کسی کو زیادہ قابل سمجھنا۔ واضح رہے کی نسب ایک ثابت چیز ہے مثلا میرا لڑکا میرا لڑکا ہے یہ حقیقت ہے جو ثابت ہے، جیسے چہرے کا حسن ایک ثابت چیز ہے مثلا یہ شخص خوبصورت ہے تو ہے، و ایسے ہی نسبی فضیلت بھی ایک ثابت چیز ہے مثلا ایک عالم کا لڑکا نسب میں ایک بھنگی کے لڑکے سے افضل ہے، یعنی پہلے کی نسبت دوسرے کی نسبت سے افضل ہے۔ لیکن اس سے ایک شخص کو دوسرے سے یا ایک قوم کو دوسری سے افضل سمچھنا حماقت ہے، بلکہ خباثت ہے۔ کیونکہ جب سماج کسی قوم کو افضل سمچھتا ہے و اس کا زیادہ احترام کرتا ہے تو ترقی و فراخی کے تمام اسباب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جیسے مال، سیاسی اقدار، رعب، ان کی بات کی سنوائی، احساس برتری و حوصلہ افزائی وغیرہ، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انہیں زیادہ اچھی تعلیم، سیاسی سمجھ، خود توقیری وغیرہ حاصل ہوتی ہے جو انہیں دوسروں سے افضل و قابل بناتی ہے، و اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ سماج کو لگتا کہ ان کی فضیلت و قابلیت ان کے نسب و خون کی وجہ سے ہے، تبھی ان کے غیر میں نہیں ہے یعنی وہ دوسروں سے افضل ہیں، و یہ دائرہ نسل بنسل جلتا رہتا ہے۔ و پسماندہ اقوام جنہیں اسباب نہیں ملتے، باوجود ان میں عقلمند و سمجھدار لوگوں کے ہونے کے، وہ پیچھے رہ جاتی ہیں، لیکن سماج اس بات کو نہیں سمجھتا تو یہ اعتقاد گڑھ لیتا ہے کہ کمی ان کی ذات میں ہے و وہ خود بھی اسی عقیدہ کا شکار ہو جاتے ہیں، تو ان کے حوصلے بالکل پست ہوتے جاتے ہیں۔ لہذا ہمیشہ دبے رہتے ہیں و کبھی آگے نہیں بڑھ پاتے۔ لہذا نسل و برادری کی وجہ کسی کو دوسرے پہ فضیلت دینا ظلم ہے۔

کسی قوم کے لیے اس کے داخلی امور کا درست ہونا ضروری ہے، یعنی ان کا آپس میں ہم آہنگ ہونا۔ و اس کے لیے ظلم کا خاتمہ ضروری ہے کیونکہ اگر ظلم ہوگا تو فساد و تفرقہ تو ہونا ہی

[9] تدریج ساماجی یعنی Social status.

ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک طبقہ کو لگتا ہے کہ اس پہ ظلم ہو رہا ہے، حالانکہ ظلم ہوتا نہیں ہے، و یہ بات قوم میں تفرقہ و فساد کی باعث بنتی ہے۔ و ایسے معاملوں میں ہم کچھ نہیں کر سکتے، کسی کے وساوس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن جہاں کر سکتے وہاں تو کرنا چاہئے یعنی اپنے ہاتھوں کو ظلم سے روک کے رکھنا چاہیے، و ہمیشہ عدل کرنا چاہئے۔ و عدل حق والے کا حق ادا کرنا ہے۔ لیکن کس کا کیا حق ہے یہ ایک مسلَّم ہے تو کبھی ایک فریق ایک چیز کو اپنا حق سمجھتا ہے جبکہ دوسرا فریق اسے اس کا حق تسلیم نہیں کرتا، تو ایسے میں فساد ہوتا ہے، لہذا حجت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ و حجت ہمارے یہاں دو ہیں معقول و منقول۔ منقول کی اقسام چار ہیں قرآن و سنت و اجماع و قیاس، و معقول کی دو ہیں حسیات و تجربات۔ و منقول کی اقتدا کرنا لازم ہے بشرطہ کہ وہ معقول کے خلاف نہ ہو۔ و اگر وہ اس کے خلاف ہے تو یا تو تاویل ہوگی یا توقف، یعنی منقول کا معنی چھوڑ دیا جائے گا پھر چاہے بدل دیا جائے یا خاموشی اختیار کی جائے۔ لیکن معقول کو ویسے ہی تسلیم کیا جائے گا جیسے ثابت ہے۔ و جو لوگ اس طریقہ کے خلاف جائیں تو سمجھ لو کہ وہ جاہلوں کے لشکر سے ہیں، و ان سے دور رہو، کیونکہ وہ دلیل تواتر کے منکر ہیں جس سے قرآن ثابت ہے لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔ و اگر وہ کہتے ہیں کہ وہ تواتر تسلیم کرتے ہیں لیکن مذکور طریقہ کو تسلیم نہیں کرتے تو ثابت ہوا گہ وہ جاہل ہیں کیونکہ دونوں ایک ہی نوع کی دلیل ہیں۔

ایک سماج میں چار شعبے ضروری ہیں۔ زراعت و صناعت جن کا کام سماج کی حاجت کی چیز پیدا کرنا و بنانا ہے مثلا اناج، دوا، کپڑا، ہتھیار، وغیرہ۔ تجارت جس کا کام حاجت مند تک مصنوعات و غذا وغیرہ پہنچانا ہے و جو چیزیں ہمارے یہاں نہیں بنتی انہیں دوسری قوموں سے لانا ہے۔ حراست جس کا کام سماج کو لٹیروں و دشمن قوموں سے بچانا ہے۔ سیاست جس کا کام سماج کو درست رکھنا ہے و لوگوں کو ان کا حق دلانا ہے و ان سے شر و فتنہ کو دور کرنا ہے و ان چیزوں میں تفکر کرنا ہے۔ لیکن ہندؤں نے ان شعبوں کو انسان کی پیدایش کے ساتھ جوڑ دیا یعنی ان کی نسل کے ساتھ، جس کا انجام یہ ہوا کہ لوگ نسل کے اعتبار سے چار شعبوں میں بٹ گئے سب سے اوپر برہمن، پھر چھتری، پھر ویش، پھر شودرا۔ ان میں سے سب

سے زیادہ بھاو برہمن کو ملا کیونکہ اس کا کام تعلیم و تفکر ہے، و سب سے کم شودرا کو کیونکہ اس کا کام سفائی ہے و تعلم اس لیے حرام ہے۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ تمام سیاست و اقتصادیات سب برہمنوں کے ہاتھ میں چلی گئی جبکہ شودرا مزید حاشیہ پہ چلا گیا و درمیان والے بھی اپنے درجے کے اعتبار سے اسباب پائے۔ و ایسے ہی مسلمانوں میں شریف زادے ہمیشہ علم و سیاست و ہر معزز شعبوں میں حاوی رہے ہیں، و ساتھ میں یہ باطل عقیدہ بھی کہ وہ اوصاف حسنہ کے زیادہ حامل ہیں یعنی زیادہ سمجھ، زیادہ ہمت، زیادہ صلاحیت وغیرہ۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ جنسی فضیلت کا عقیدہ وجود میں آیا۔ لیکن جب اسلامی حکومت ختم ہوئی و سیکلریت آئی و برابری کا نظریہ شائع ہوا، مثلا بھارت میں، تب ہم نے دیکھا کہ مسلمانوں کے پچھڑے طبقات نے بھی ہر میدان ترقی پائی و شریف زادے پیچھے آ کر برابر ہو گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی حکوم دو بارہ آتی ہے تو یہ اعتقادات بھی لوٹیں گے یعنی پھر سے ظلم ہوگا؟ یہاں یہ بات یاد رہے کہ بھارت میں برابرئ کل نہیں ہے کیونکہ سب سے اوپر ہندو برہمن ہے پھر ایسے ہی نیچے تک باقی ہیں، و بہر حال مسلمان تو وہ سب سے نیچے ہے لیکن آپس میں تقریبا برابر ہو گئے ہیں۔

ہم ایک لڑکے کو خوب کھلاتے ہیں یہ بول کے کہ اس کا پاپ، دادا، پڑ دادا وغیرہ خوب صیحت مند تھے، خوب کھاتے تھے، لہذا اسے بھی خوب کھلاو کیونکہ اگر اسے کم کھلایا تو اس کا پیٹ نہ بھرے گا و یہ بھوکا رہ جائے گا جس سے اس کو اذیت ہوگی۔ و ایک لڑکا ہے جسے ہم کم کھلاتے ہیں یعنی بھوکا رکھتے ہیں یہ بول کے کہ اس کا باپ، دادا، پڑ دادا وغیرہ سب روکھے سوکھے تھے، لہذا اسے بھی زیادہ کھانے کی حاجت نہیں ہے، بلکہ زیادہ کھلانے سے اسے بد حذمی ہو جائے گی، یعنی اذیت ہوگی، لہذا اس کے لیے اچھا ہے کہ اسے کم کھلاو۔ نتیجہ ہوا کہ پہلا والا ہمیشہ موٹا تازا رہے گا، و دوسرا و والا ہمیشہ روکھا سوکھا رہے گا۔ لیکن اگر ہم اپنے فاسد عقیدہ کو چھوڑ دیں و کھانا دونوں کو برابر سے فراہم کریں تو پائیں گے کہ دونوں ہی صحت یاب ہو جائیں گے، و اگر دونوں ہی سے کھانا روک لیں تو دونوں سوکھ جائیں گے۔ و اسی طرح جب نسلی فضیلت کے اعتبار سے اسباب ترقی تقسیم کیے جاتے ہیں، و اسباب

ترقی میں سب سے اہم درجۂ سماجی[10] ہے۔ تو جو جتنی اوچی سمجھی جانے والی نسل سے ہوتا ہے وہ اتنا زیادہ پاتا ہے لہذا ہمیشہ اتنا اوپر رہتا ہے۔ و جو جتنا نیچا سمجھا جاتا ہے وہ ان اسباب سے اتنا ہی کٹا ہوتا لہذا اتنا پیچھے رہتا ہے۔ و یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ سے بھارت میں، خواہ ہندووں کا دور ہو یا مسلموں کا، اشرافیہ ہمیشہ اگڑے رہے ہیں کبھی پیچھے نہیں ہوئے۔ جبکہ پچھڑے ہمیشہ پچھڑے رہے ہیں کبھی آگے نہیں ہو سکے۔ واضح رہے یہاں میں اقوام کی بات کر رہا ہوں افراد کی نہیں، کیونکہ اس میں استثنات ہیں مسلمانوں میں مثلا امام فقہاء فارسی ہے و امام محدثین بھی فارسی ہے وغیرہ، نہ کہ ہندووں میں کیونکہ اسلام میں ہنود کے مقبلہ کافی چیزوں میں برابری ہے۔ لیکن اقوام میں حقیقی برابری تو دور جدید میں ہی ظاہر ہوئی جب غربی افکار حاوی ہوئی کہ برادری و نسل و نسب سب برابر ہیں و ان سے کوئی صفات حسنہ متعلق نہیں ہے، یعنی ایک نسل کو دوسری پہ کوئی طبیعی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ و یہ بات ادلآء یقینیہ و تحقیقات سائنسیہ سے ثابت ہے۔

تو عنصریت کا خاتمہ واجب ہے، و جو عالم اسے سکھائے تو اس کا قتل واجب ہے، و جو حاکم اسے پھلائے اس کے خلاف بغاوت واجب ہے۔ و اگر سوال کیا جائے عورتوں کی برابری کا تو میں کہوں گا کہ انہیں پورے طور پہ مردوں کے برابر کہنا تو ظلم ہے کیونکہ بالطبع مرد و عورت برابر نہیں ہیں مثلا جسمانی طاقت۔ لیکن جن امور میں برابر ہیں ان میں حقیر سمجھنا بھی ظلم ہے مثلا فہم۔ تو یہ سبب سماج کی صحت کے لیے ضروری ہے یعنی اس سے کم پہ اکتفاء کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بنا اس کے عدلِ سماجی کا کوئی امکان نہیں۔

لیکن سماج کی درستگی کے لیے صرف یہی ایک مسئلہ کافی نہیں ہے۔ بلکہ مزید بہت سی اوصاف مطلوب ہیں جیسے صدق، دیانتداری، امانت کی ادائیگی، دوسرے پہ احسان، اپنی جان کی قربآنی، ضعفاء کی مدد، خوش زبانی، دوسرے کی خطا پوشی وغیرہ۔ و بہت سی صفات کا خاتمہ مطلوب ہے جیسے وہ جو بیان کردہ کی ضد ہیں یعنی کذب، امانت میں

[10] درجۂ سماجی یعنی Social status.

خیانت، چغلی و غیرہ۔ و اس موضوع پہ ایک مستقل کتاب مطلوب ہے تو اسے انشاء اللہ اسی میں ذکر کروں گا۔